

محسن حامد کا ناول عالم گیریت کا تناظر: ذاتی اور سیاسی شناخت کا مظہر

ڈیوڈ واٹر مین /

منیب الحسن رضا*

(۱)

پروفیسر ڈیوڈ واٹر مین^۱ (David Waterman) نے اپنی کتاب: Where Worlds Collide: Pakistani Fiction in the New Millennium^۲ میں پاکستان میں انگریزی ناول نگاری اور منتخب ناول نگاروں، جن میں محسن حامد^۳، کاملا شمس، ندیم اسلم، ایچ ایم نقوی، محمد حنیف، ثریا خان اور عظمیٰ اسلم شامل ہیں، کو موضوع بنایا ہے، کتاب مذکور میں شامل ڈیوڈ واٹر مین کا مضمون: Focus on the Fundamentals: Personal and Political Identity in Mohsin Hamid's *The Reluctant Fundamentalist* جس میں محسن حامد کے ناول کو موضوع بنایا گیا ہے اس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

(۲)

عالم گیریت کے تناظر میں ثقافتی سرگرمیاں اور اقدار کی تبدیلی کے رویے نے سرحدوں سے ماورا انسانی شناخت پر زور دیا ہے، محسن حامد کا ۲۰۰۷ء میں لکھا گیا ناول *The Reluctant Fundamentalist* ایک الگ ہی دنیا کی کہانی پیش کرتا ہے جس کا حقیقی تعلق ایک انوکھی شناخت سے ہے اور اس میں دیارِ وطن سے دور لوگوں کی شناخت کا مسئلہ بھی اٹھایا گیا ہے۔ دراصل یہ اس رجحان کی بازگشت ہے جو عالم گیریت کے سیل رواں کے باوجود ہر فرد اپنی ایک ذاتی اور حقیقی شناخت بھی رکھتا ہے جو کسی دوسری شناخت کا اثر قبول کر لینے کے باوجود ختم نہیں ہوتی اور اس کے نتیجے میں ایک ایسا فرد اور شناخت جنم لیتی ہے جو اندرونی نفسیاتی دشواریوں کا منبع ہے اور اسی لیے مغربی معاشرے میں پلتے بڑھتے اذہانِ ثقافت، فرقہ، ذات، رنگ و نسل سے اگر بے نیاز ہو بھی جائیں تو ان کے اندر کا مزاحمتی عنصر برقرار رہتا ہے۔ اس کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ شناخت کو مدغم کرنے کا عمل جاری رہتا ہے جس سے شناخت کا وسیع منظر نامہ جنم لیتا ہے۔ وینسیا اور شیوز (Vaneessa and Sheues) اس عمل کو سماجی تحریک کے طور پر دیکھتے

* ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جامعہ کراچی، مقیم کراچی

ہیں۔ پاکستان کے دو اہم ناولوں کے ضمن میں یہ بات کہی جاسکتی ہے محسن حامد نے اپنے انگریزی ناول میں اس موضوع کا احاطہ کیا ہے۔ [ان دونوں میں سے ایک نیلیم احمد بشیر کا ناول ہے]۔

اپنی بنیادی اور لازمی شناخت کو جاننے کا عمل اکثر ایک نوع کی محفوظ حد بندی کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ حد بندی ایک فرد کے لیے نہایت ضروری ہے تاکہ وہ زندگی میں آگے بڑھتے ہوئے اپنی اصل شخصی و بشری خوبیوں و خامیوں کا پتہ لگا سکے۔ اپنے حصار میں آجانے سے فرد کی مشکلات یکسر ختم نہیں ہو جاتیں مگر زندگی کی بے یقینی اور تیز رفتاری کو ایک سہارا ضرور مل جاتا ہے۔

چنگیز نام کا ایک پاکستانی اس ناول کا مرکزی کردار ہے جو امریکا کی ایک بہترین جامعہ پر انسٹن (Princeton) کا فارغ التحصیل ہے، مگر [یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ خود محسن حامد کا تعلیمی تعلق بھی اسی یونیورسٹی سے ہے]۔

وہ نہ ہی تارکین وطن میں شمار ہوتا ہے اور نہ ہی ایک غیر ملکی ہے، بلکہ وہ خود کو ایک نیویارکر (New Yorker) کی حیثیت سے دیکھتا ہے اور ناول نگار کے الفاظ میں ”اس معاشرے کے سرکردہ طبقات کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑا ہوتا ہے۔“

چنگیز سے وابستہ چند ہی لوگ اس بات کو سمجھ پائیں گے کہ ان کا گھر اور شناخت، امریکا آمد اور یہاں کے معاشرے کو دیکھنے کا زاویہ کیسے تبدیل ہوا۔ 9/11 کے حملوں کے بعد اس تبدیلی کو نیل جے اسمیل سر (Neil J. Smelser) ایک تہذیبی حادثہ قرار دیتے ہیں اور چنگیز کی زندگی پر پڑنے والے ان اثرات سے وابستہ کرتے ہیں جنہوں نے اس کی بنیادی شناخت کو ابھارا اور اس کی ترجیحات کو بدلنے میں اہم کردار انجام دیا۔ ان حملوں کے تناظر میں جہاں ہر امریکی قوم پرستی کی ایک نئی لہر کا شکار ہوا، وہیں چنگیز بھی یہ سوچنے لگا کہ تاریخ کو جانے بغیر مستقبل اور حال کو دیکھنا ممکن نہیں۔ بہر حال اسے یہ سب پسند نہیں آیا۔ امریکا کی بڑھتی ہوئی بالادستی نے اس کے خاندان کو بھی خطرے میں ڈال دیا تھا اور جیسا کہ ناول میں کئی جگہ اس نے کہا ”ان تمام واقعات کا آپس میں ایک تعلق ہے کیوں کہ ہر امریکی مفاد دہشت گردی کے خلاف اس جنگ سے جڑا ہے۔ وہ اپنی ذات کو بالادست طبقات سے وابستہ محسوس کرتا ہے اور اس کی نئی امریکی کمپنی انڈرووڈ سیمسن (Underwood Samson) اسے اپنے خوابوں کی تکمیل میں معاون نظر آتی ہے جس میں وہ ذات اور شناخت کی غیر محسوس تبدیلی کا عمل جاری رکھے ہوئے ہے جس کے بارے میں اسٹورٹ ہال (Stuart Hall) نے لکھا کہ:

شناخت سازی ایک مکمل مثبت عمل ہے۔ البتہ اس کا آغاز منفی شناخت کے ذریعے ہوتا ہے اور یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کسی سوئی کے ناکے سے ایک بال گزارا جائے۔

کام سے بددلی اور مایوسی چنگیز کو لاہور آنے پر مجبور کر دیتی ہے اور اس کہانی میں ایک نئے کردار کی موجودگی کا انکشاف ہوتا ہے جس کا تعلق بھی امریکا سے ہے اور دونوں ایک کھانے کی میز پر اپنی اپنی شناخت سے متعلق کہانی سنارہے ہیں، جن میں ضمناً ان کے ممالک کا تذکرہ بھی آتا رہتا ہے۔ ذاتی اور سیاسی شناخت جب مدغم ہو جائیں تو ان کو علاحدہ کرنا مشکل ہوتا ہے اور یہ مشکل صورت حال اس وقت ایک نیا موڑ لیتی ہے جب شناخت کا تعلق جغرافیے سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں جب دو معاشرے آپس میں نہایت قریب آجائیں اور ان کے درمیان اعتماد سازی کا عمل بھی مجروح ہو اہو تو دونوں ہی مسائل کے ذمہ دار ایک دوسرے کو ٹھہرانے لگتے ہیں۔

سیاست دراصل قریب آنے کا نام ہے۔ سیاست اس بات کو بنیادی سوال بنا کر پیش کرتی ہے کہ شناخت کیسے پیدا ہوتی ہے اور کیسے اس میں دیگر شناختی یا شخصی عناصر مل کر یک جا ہوتے ہیں سیاسی شناخت وسیع مفہوم رکھتی ہے نہ صرف ایک فرد کی ہیئت کے لحاظ سے بلکہ ایک فرد کی تمام تر وابستگیاں جیسے ادارہ جاتی صف بندی نظریاتی ساخت اور دیگر امور بھی اس کے دائرہ کار کا حصہ ہیں جنھیں ڈسچمنس اور شیوسر (Duschane and Scheucr) گہرائی یا تقسیم کا عنوان دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ایسا لگتا ہے کہ سیاسی شناخت کا بنیادی مقصد مختلف عناصر کو ان کی ترتیب کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مد مقابل لانا ہے جسے تقسیم در تقسیم کے ذریعے واضح کیا جاسکتا ہے۔ تقسیم دراصل سرحدی لحاظ سے نہیں بلکہ دو گروہوں کے تضادات کو ایک سلسلہ وار ترتیب میں لانے اور پیش کرنے کا نام ہے۔ تقسیم ایک ضمنی شناخت کا بھی نام ہے جس میں فرد اپنی ذاتی حیثیت اور علاقے کی بنیاد پر وابستہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کی سماجی زندگی ذاتی زندگی سے مختلف ہو کر ایک ربط باہم بناتی ہے۔ ایسی تقسیم کا عمل فرد کو بنیادی طور پر ایسے موڑ پر لا کھڑا کرتا ہے جہاں اس کا خود کو ظاہر کرنے کا عمل دوسروں کی شناخت سے جڑ جاتا ہے اور وہ سب کو اس تقسیم کی عینک سے دیکھنے لگتا ہے۔“

اس تقسیم کے عنصر کو جغرافیائی حد بندی سے آگے نکل کر دیکھنے کی ضرورت ہے جس میں چنگیز کا معاملہ چنداں مختلف نہیں کیوں کہ اسے اپنی مذہبی اور خاندانی روایت کا مکمل احساس تھا۔ جو اس کے لیے احساسِ تفاخر کا باعث تھا۔ اس رویے کو نیکولس روز (Nikolas Rose) سلسلہ نسب کے طور پر دیکھتا ہے اور لکھتا ہے کہ اپنے نسب نامے کا احساس ہونا، بالخصوص اس وقت کہ جب نفسیاتی شخصیت تکمیلی مراحل میں ہو تو اس کے اثرات حیاتیاتی سطح پر بھی مرتب ہوتے ہیں جنھیں ہم خاندانی سوانح کا ارتقائی سفر بھی کہتے ہیں۔

یہاں چنگیز کے کردار سے ایک مکالمہ درج کرتے ہوئے محسن حامد لکھتے ہیں کہ:

میرے پردادا ایک وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ پنجاب کے لوگوں کے لیے ایک اسکول کے بانی بھی تھے اور اس طرح میرے دادا اور والد نے اپنی تعلیم لندن کی جامعات سے مکمل کی تھی۔ گلبرگ لاہور میں ہمارا گھر ایک ایڈڑ پر محیط ہے جس میں کافی ملازم بھی ہمہ وقت دستیاب رہتے ہیں۔

ہر نسل پچھلی سے کم وسائل کی حامل تھی، جس کی بنیادی وجہ افراط زر اور خاندان کے اثاثوں کا پے در پے تقسیم ہونا ہوتا ہے، مگر چنگیز کے خاندان کو فردوسِ گم گشتہ کا ایک نمونہ کہا جاسکتا ہے، جس طرح وہ پورے ناول میں اس بات پر اصرار کرتا رہا کہ ان کا خاندان اب بھی مستحکم ہے اور اس نے یہ کہا کہ ”دولت کے مقابلے میں شخصیت آہستہ آہستہ ماند پڑتی جاتی ہے۔ اس جملے کو پاکستانی تاریخ کے تناظر میں دیکھنا چاہیے جو ایک طرح سے چنگیز کے ذریعے ناول میں بیان ہو رہی ہے جس کے نتائج نے اسے افسردہ کیا۔ ڈیوڈ واٹر مین ناول سے اقتباس نقل کرتا ہے کہ: امریکا میں قیام کے دوران ایسے تضادات اور مماثلتیں مجھے تکلیف دیتی تھیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مجھے موازنے پر مجبور کرتی تھیں۔ چار ہزار سال پہلے دریائے سندھ کے کنارے آباد شہر پختہ اینٹوں سے بنائے جاتے تھے اور امریکا جس کی بنیاد میں تجارت اور وحشی درندگی کا فرما تھی اس وقت کہاں تھا؟ مگر آج ہمارے بے ہنگم شہر کہاں ہیں اور ہمارا تعلیمی بجٹ امریکا کی کسی ایک یونیورسٹی جتنا نہیں۔ یہ سب مجھے شرمندہ کرتا ہے۔

ایسے موازنے اس کی پیشہ وارانہ زندگی میں بھی اسے کبیدہ خاطر کرتے رہے، بالخصوص اس کی قانونی مشاورت فراہم کرنے والا ادارہ جب اسے فلپائن بھیجتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ بدنام زمانہ منیلا بھی لاہور سے زیادہ ترقی یافتہ نظر آتا ہے، مگر آہستہ آہستہ وہ اپنی رائے ترقی اور دولت کے بارے میں بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

چنگیز کے آبائی ملک کی طرح اس کی اپنی خاندانی تاریخ بھی کئی صورتوں پر مشتمل ہے۔ وہ اس بات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرا تعلق لاہور سے ہے، جس کے ایک پوش علاقے گل برگ میں میرا گھر ہے اور لاہور پنجاب میں ہے جو صدیوں سے بیرونی فاتحین کی گزر گاہ رہا ہے جس میں آریا، منگول اور انگریز شامل ہیں۔ چنگیز کا اپنے ماحول اور گرد و پیش کے بارے میں یوں اقرار کرنا گویا نیویارک کے کثیر اللسانی اور کثیر الجہتی کلچر کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے اور اسی لیے اسے وہاں ابتدا میں ہی اجنبیت کا احساس ہونا ختم ہو گیا تھا۔ ناول میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جس طرح چنگیز کا داخلہ ایک معتبر یونیورسٹی میں اسکالرشپ حاصل کرنے کے بعد ہوا اور اس کی بنیادی شرط یہ ہی رکھی گئی کہ وہ دیگر امریکی ہونہار طلبہ کے ساتھ مل کر اپنی صلاحیتوں کا بہتر استعمال اس معاشرے کے لیے کرے گا جس کا وہ اب حصہ بننے جا رہا ہے۔

موسم سرما کی پہلی چھٹیاں اس نے یونان میں دیگر ہم جماعتوں کے ساتھ گزاریں، جو اسے دور دراز دنیا سے آیا ہوا ایک ہم کتب سمجھتے تھے اور اس سے زیادہ درجہ دینے کو تیار نہ تھے۔ چنگیز خود کو سمجھاتے ہوئے کہتا ہے کہ ”میں پاکستانی معاشرے میں رہنے کے سبب دولت کے محدود استعمال سے واقف تھا، مگر یہاں کے لوگ جو شاید معاشرتی ڈھانچے کے مطابق امیر نہیں کہے جاسکتے مگر وہ ان تعطیلات پر مجھے ایک نئے روپ میں نظر آئے اور میں امریکا کی برتری کا (اس کے متوسط طبقے کے سبب) قائل ہوتا چلا گیا۔

ان ہی چھٹیوں کے دوران چنگیز کی ملاقات ایریکا سے ہوئی جو بعد ازاں ناول میں اسے مزید باطنی آنکھ کے ذریعے دیکھنے کا موقع فراہم کرتی رہی، بالخصوص نیویارک کے حوالے سے اس کی معلومات قابل رشک نظر آتی ہیں۔ چنگیز خود اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ یونان کی سیر کے دوران قدیم یونانیوں کے عجائبات نے مجھے اس بات کا احساس دلایا کہ مشرق کا کس قدر خوف یونانیوں پر بھی طاری تھا اور ترکوں کے حملے سے بچاؤ کے لیے تعمیر کی جانے والی دیوار اب بھی قائم تھی اور مجھے اس بات کا احساس دلایا کہ میں تاریخ کے متبادل دوراں پر پرورش پا کر بڑا ہوا ہوں۔ مگر اب مغرب ہی انسانی ہمدردی اور شخصی آزادی کا سب سے بڑا علم بردار ہے۔ تعطیلات سے فراغت کے بعد چنگیز کی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ہوتا ہے اور اسے اپنے دفتر کے پہلے ہی دن اپنے احساسِ تفاخر کا علم ہوا، لہذا محسن حامد نے اس کے الفاظ کو قلم بند کرتے ہوئے لکھا کہ:

آج میں خود کو پاکستانی نہیں بلکہ نیویارک کی اس مہنگی ترین قانونی مشاورت فراہم کرنے والی کمپنی کا معمولی حصہ سمجھ کر بھی خود پر فخر کر رہا تھا۔ [یہاں یہ ذکر کرنا قابل غور ہو گا کہ خود محسن حامد کا تعلق بھی اسی کمپنی سے ہے] اب چنگیز امریکا کی شناختی اقدار کے سہارے اپنی پہچان بنانے کی کوشش کرنے لگا اور لاہور رفتہ رفتہ اس کی گفتگو کا حصہ نہ رہا۔ ایڈورڈ سمنسن (Underwood Samson) کے ابتدائی حروف کو پرکھا جائے تو امریکا کا مخفف (U.S) بتا ہے جو پر تشدد سرمایہ دارانہ جگہ کا استعارہ ہے۔ نوکری کی پہلی شام چنگیز اپنی کمپنی کے لوگوں کی کثیر الجہتی، کثیر اللسانی تعداد دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس انداز کو ہما ابراہیم (Huma Ibrahim) صارف کلچر کے طور پر دیکھتی ہیں جن پر امریکی جامعات کا بہت اثر ہے۔ محسن حامد نے چنگیز کے مکالمے کو یوں بیان کیا ہے:

مجھے ان کی شناخت سے زیادہ خود کو ان کے درمیان مدغم کرنے کی فکر تھی، بلکہ یوں لگ رہا تھا کہ ہم اب ناقابل شناخت ہو چکے ہیں۔

یہاں ایک ساتھی ملازم چنگیز کو اس کے بدلتے خیالات اور ترقی کی دوڑ میں لگے رہنے کو محسوس کرتے ہوئے اسے ترقی کے متبادل بیانیے سے بھی آگاہ کرتا ہے اور اسے آسمانوں پر چلنے والے انوکھے مسافر کا لقب دیتا ہے۔

یہاں خیالات کا ایک بحر بے کنار کئی سوالات پیدا کرتا ہے کہ چنگیز کیا اپنی نسلی شناخت کو بھولتا جا رہا ہے یا وہ ایسے حالات پیدا کرنے پر قادر ہے کہ اسے نیویارک کی ہر دم بھاگتی زندگی دیکھنے اور جینے میں مزہ آنے لگے؟ اس ذو معنویت اور تضادات کے ٹکراؤ کو پوہی الکو تاسی (Pohi Alqowtasi) ایسے علم کا نام دیتی ہیں جو پہلے سے واقعات کو دیکھ کر پیدا کر لیا جائے اور آپ کو چیزیں ویسی ہی نظر آئیں جیسی آپ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ناول میں انڈروڈ سمن کا مینجر جم، جس کی کہانی کسی حد تک چنگیز سے ملتی جلتی ہے اور وہ چنگیز کو اس کمپنی میں خوش آمدید کہتے ہوئے اس کا یہاں آنا خود اس کے لیے مبارک اور خوش آئند قرار دیتا ہے، مگر ناول میں اکثر مقامات پر اس نے چنگیز کو بے چین، اور اپنی موجودہ زندگی سے نامطمئن بھی کہا، یعنی ایک ایسا شخص جس کے اندر کوئی فطرتی جنگجو چھپا ہو۔

یہاں چنگیز کا تاثر ایک تاریخی کردار کے طور پر ابھارنے کے بجائے محسن حامد نے اسے اپنے ماضی کی عظمت کو تلاش کرتے ہوئے دکھایا ہے جو بذاتِ خود اس ناول کے بیانے سے متصل ایک تکنیک ہے، جسے ہم عمومی طور پر فلیش بیک کہتے ہیں۔

جم، چنگیز کو ملازمت کی پیش کش کرتے ہوئے اسے معاشی و اقتصادی سیڑھی پر چڑھنے کا گرباتا ہے اور خود چنگیز کے الفاظ میں اسے اس پیش کش کے ذریعے اپنے ماضی کو کھوجنے کا ایک موقع ملتا ہے اور اس پیش کش کو وہ قبول کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

”میری مثال ایک ایسے بچے کی سی ہے جسے ٹافیوں سے بھری دکان میں لامحدود اختیارات کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا ہو اور اس موقع پر میں نے وہی کیا جو اس بچے کو کرنا چاہیے تھا۔“

جم کی مذکورہ پیش کش چنگیز کو اس کی عظمتِ گم گشتہ کی تلاش میں مدد کرتی ہے اور اس کے سامنے امریکا ایک ایسی خوابوں کی سرزمین بن جاتا ہے جہاں اس کا سامنا تعبیر سے تھا، مگر بعد میں اسے احساس ہوا کہ جم ٹھیک کہتا تھا اور وہ ایک بے سمت فوجی کی طرح نیویارک سے لاہور جا پہنچا ہے۔

قومی شناخت کے عناصر میں صرف جغرافیائی عوامل کا دخل نہیں ہوتا۔ ہم جن احساسات کے ساتھ پرورش پاتے ہیں وہ بیرونِ ملک بھی ہمارے ساتھ سفر کرتے رہتے ہیں۔ کیتھلین ایم کربائی (Kathleen M. Kirby) لکھتی ہیں کہ مستقل دماغ میں پرورش پانے والے خیالات کا تعلق ان ثقافتی عناصر سے ہوتا ہے جن میں وطن پرستی کا عنصر جھلک رہا ہوتا ہے۔ یہاں جم کی پیشہ وارانہ صلاحیتیں ماند پڑتی نظر آتی ہیں اور وہ چنگیز کے دماغ کو کھگانے میں ناکام ہوتا ہے کہ کس طرح ایک ہی قانونی مشاورت فراہم کرنے والی کمپنی سے نوکری کا آغاز کرنے والے دو لوگ کیسے مختلف ہو سکتے ہیں۔ دراصل وہ یہ بھول گیا تھا کہ ان دونوں کا نسب نامہ مختلف تھا اور چنگیز اس سے تعلیمی و پیشہ

وارانہ مطابقت رکھنے کے باوجود اپنے نسب نامے پر فخر کرتا تھا۔ جہاں جم اپنے ماضی کو بھول کر امریکا کی برتری کا ایک جزو بن چکا تھا۔ چنگیز ایک الگ ہی دنیا کا باسی نظر آتا ہے جس نے امریکا کی عظیم برتری، تفاخر، نسلی امتیاز اور انسانی ہمدردی کا بھرم ایک ہی ٹھوکر میں چمکانا چور کرتے ہوئے ایک انوکھا فیصلہ کیا۔ چنگیز کا کردار اس ناول میں اس طرح تخلیق کیا گیا جس نے لاکھوں قانونی تارکین وطن کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کیا، تعلیمی و پیشہ وارانہ زندگی میں امتیازات کا حامل ہونے کے باوجود وہ اپنے ماضی سے پیچھا نہ چھڑا اور اسی بات کو تقابلی موازنے کے طور پر فلپائن سے آنے والے اسی کمپنی کے منیجر جم کی زندگی سے جوڑ کر دکھایا گیا۔ جم جانتا ضرور تھا کہ وہ کون ہے اور کیا بن چکا ہے، مگر چنگیز پورے ناول کے دوران ایک ”اضطراب کی کیفیت“ کا شکار رہا جسے لیون فرسٹیجس (Leon Frestiges) اور اسٹیپلین ہیٹھ (Stiplen heath) شعوری بے عقلی کا نام دیتے ہیں۔

یہاں اس ناول کا ہر ناقد اس بات پر متفق ہے کہ چنگیز کیوں امریکا کی زندگی میں گزر بسر سے خود فراموشی کی طرف راغب ہوا اور بالآخر پاکستان لوٹ گیا، یہ عمل جم کو آخر تک سمجھ نہیں آیا اور وہ چیتھڑوں سے امارت تک کے اس سفر کو حیرت سے دیکھتا رہا۔ مگر چنگیز اسے حیران کر گیا۔ [خود محسن حامد اس ناول میں مرکزی کردار کی اس کا پلاٹ کی کوئی معقول توجیہ نہیں پیش کرتے بلکہ قاری کی صوابدید پر اس کا فیصلہ چھوڑتے ہیں]

یہ بات قابل ذکر ہے کہ چنگیز بھی جم کی طرح ذاتی شناخت کے بجائے قومی شناخت کے تند و تیز سیلاب میں بہتا جا رہا تھا اور جدید انسان کے اس المیے کو لسانیاتی لحاظ سے بھی اس ناول کے ناقدین اور دیگر سماجی ماہرین نے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

”شخصی اور ذاتی حوالوں سے پہلا تعلق فرد کے ذریعے فرد سے جڑنا اور اس کا لسانیاتی اظہار ہم اور وہ کے صیغوں میں کرنا اس ناول کا بھی ایک موضوع ہے۔ شناخت کی یہ محرومی جدید انسان کی بنیادی اصطلاح ہے جو ایک نفسیاتی کش مکش کی طرف اشارہ کرتی ہے جس میں فرد میں کو بھول کر ہم اور اپنے کے تصور سے جڑ جاتا ہے اور یہی عمل اسے خود سے جڑنے سے روکتا ہے۔“

ایک سیاسی شناخت ہی ذاتی شناخت کو پس پشت ڈالتے ہوئے آگے بڑھتی ہے اور اس کے مضمرات کو سامنے رکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی شناخت کی جڑیں انفرادی اعتبار سے ذہن میں پیوست ہو جاتی ہیں جس کی مثال چنگیز کا ایریکا سے رکھا جانے والا رویہ ہے کہ وہ کس طرح اپنے من پسند شخص کی تلاش میں تھی اور چنگیز کبھی اس کا متبادل نہ بن سکا۔ کچھ ایسے واقعات رونما ہوتے رہے جو چنگیز کو اس کے آبائی ملک بھیجنے کا سبب بنے بالخصوص ۱۱/۹ کا حادثہ جو اس نے منیلا میں ایک ٹیلی ویژن سکرین پر دیکھا جس کے بارے میں اس نے وطن واپسی کے بعد

لاہور میں ایک تقریب میں ایک پراسرار امریکی کوسنایا۔ جو الفاظ چنگیز نے ۹/۱۱ کے خوں چکاں حادثے کو ٹیلی ویژن پر دیکھتے ہوئے ادا کیے، وہ اس نوع کے ہیں کہ ان پر چنگیز کے کردار کی تشخیص کی جاسکتی ہے۔ اس نے کہا: مجھے زخمیوں اور متاثرین سے ہمدردی ہے کیا دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جو امریکا کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دے! اس واقعے کے بارے میں ناول کے دوران بحث نہیں کی گئی لیکن مضمون میں چند ایسے ناقدین کا حوالہ دیا گیا ہے جو اس واقعہ کو امریکی فوجی ترقی کا شاخصانہ مانتے ہیں۔ ڈیوڈ واٹر مین (David Waterman) نے ایک ناقد سمیلز (Smells) کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ کسی ثقافتی تناؤ کا نتیجہ سمجھتے ہوئے اس واقعے کو ایک طرح کا ناگزیر اور ایک دوسری ثقافت کی طرف سے ایک حملہ قرار دیتا ہے۔ ان کے مطابق جس طرح عرب اور مسلم دنیا کے ایک طبقے اور اکثریت کی جانب سے ان حملوں کی پذیرائی ہوئی، اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امریکی سماجی برتری، معاشی خود مختاری اور فوجی استحکام نے انھیں صدیوں پیچھے دھکیل دیا تھا۔

۹/۱۱ کے واقعات کے بعد بیانیے میں تیزی سے تبدیلی آتی ہے اور چنگیز کی محبوبہ ایریکا اپنے پرانے محبوب کو یاد کرنے لگتی ہے اور یوں اب امریکا کو اپنی شناخت میں مدغم ہونے والے مسلمانوں کا وجود کھلنے لگا جس کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ (چنگیز اپنا سامان لے کر وہاں سے باہر آگیا اور یوں ایک شناخت کے رخصت ہونے کا عمل شروع ہوا)۔

چنگیز کا امریکا میں اپنی ذاتی شناخت کو بھول جانے کا عمل کئی ایک واقعات کے ذریعے ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ جہاں ذاتی زندگی، سماجی زندگی کے بغیر کچھ نہ ہو وہاں مغلوب ثقافت کے حامل لوگ ایک اجتماعی کل سے جڑنا چاہتے ہیں اور چنگیز ان سے مختلف نہ تھا۔ نیلا میں کاروباری دورے کے دوران اس نے اپنے امریکی ہونے کے اثرات پر روشنی ڈالی اور پاکستان میں ایک پراسرار امریکی کو بتایا کہ میں نیویارک میں پاکستانی ٹیکسی ڈرائیوروں سے اردو میں بات کرتا تھا مگر نیلا میں فلپائن کے ڈرائیوروں سے نخوت کے ساتھ بات چیت وہاں میرے دوستوں کو سمجھانے کے لیے کافی تھی کہ میں امریکی ہو چکا ہوں۔

جہاں جم چنگیز میں مماثلتیں ڈھونڈتا رہا، وہیں اسے یہ احساس نہ ہو سکا کہ اجتماعی شناخت کی شکست کا عمل ایریکا کے ذریعے چنگیز میں شروع ہو چکا ہے اور اب چنگیز کی بنیاد پرستی دوبارہ عود کر آئی ہے جسے (Underwood) (U.S) Samson کے لیے خطرہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ایریکا چنگیز کو اس کی شناخت کے بارے میں بتانے پر مجبور کرتی رہی۔

تمہیں گھریا د آرہا ہے!

تمہیں اداس نہیں ہونا چاہیے!

یہ تمہارا گھر ہے۔

مجھے اچھا لگتا ہے جب تم بتاتے ہو کہ تم کہاں سے آئے ہو۔

مگر چنگیز ماضی پرست نہیں تھا کہ ان جملوں کے مطالب سے آگاہ نہیں ہوتا۔ چنگیز سے زیادہ یہاں ایریکا مرکزی کردار کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے اور یہ بتا چلتا ہے کہ اس کا سابقہ محبوب ایک معنی خیز نام کا حامل تھا۔ ایریکا ایک معنوی شناخت کی حامل تھی، وہ محض ایک امریکی لڑکی نہیں بلکہ پورا امریکا تھی۔ اس کے پاس سیاسی شناخت اور سماجی برتری بھی تھی مگر اس کا تجویز کردہ انسان اسے چنگیز میں نظر نہیں آ رہا تھا جس کا مطلب یہ بھی ہے کہ:

ایریکا میری کہانی سے نکل جائے گی اور مجھے اس سرزمین سے دور جانا ہو گا کیوں کہ اس کی کہانی ذاتی ہے اور میرا مسئلہ ریاستی ہے۔

یہاں چنگیز کی خود کلامی اس مقالے کے عنوان کی معنویت واضح کرتی ہے جب وہ ذاتی اور سیاسی شناخت کے پیرائے میں اپنی اور ایریکا (امریکا) کی کہانی کو دہراتی ہوئے یہ بتاتا ہے کہ:

"ہمارا بیرونی حصہ اندرونی حصے سے بھی تعلق رکھتا ہے اور ہم بیرونی سماجی شناخت کو کہیں نہ کہیں اپنے ساتھ لیے پھر رہے ہوتے ہیں۔

ناول کے دوران جن دیگر کرداروں کے چنگیز پر اثرات رہے ان میں جان اور جم کا نام اس لیے بھی سرفہرست ہے کہ وہ چنگیز کو مرکزی سماجی دورے میں جوڑنے کا سبب بنے اور چنگیز کے کردار میں کئی مشابہتیں بھی ان سے منسلک تھیں (یہ ناول سیاسی سے زیادہ سماجی ہے اور اس کے مختلف قارئین اسے امریکا کا من چاہا فرد تلاش کرنے کی کوشش میں ناکامی کا سفر بھی قرار دیتے ہیں) مترجم۔

محسن حامد نے اس ناول کا آخری باب لاہور میں اختتام کرتے ہوئے اس کا نتیجہ قاری پر چھوڑ دیا ہے جس کے ممکنہ نتائج کو کئی ناقدین نے تسلیم کیا ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ پراسرار امریکی ایجنٹ قتل ہو گیا اور چنگیز اپنے معاشرے میں دوبارہ سے عزت و منزلت کا حامل ایک ایسا شخص بن گیا جو امریکا کو رد کر کے اپنے وطن واپس آ گیا لیکن ذاتی اور سماجی شناخت کو اس طرح مدغم کرنے کا عمل اس پورے ناول کا مرکزی اظہار یہ رہا جسے امریکی سماج کا ایک رُخا اور فوری تاثر

بھی کہا جاسکتا ہے جس کو یوں لکھا گیا "شناخت کی تلاش میں ایک ثقافت سے دوسرے سماج تک کا سفر"۔

حوالہ جات:

- ۱۔ پروفیسر ڈیوڈ واٹر مین، فرانس کی ایک جامعہ سے بہ حیثیت پروفیسر وابستہ ہیں۔ شعبہ اطلاقی عالمی زبانیں اور ان کا ادب سے وابستہ ہے۔ وہ پاکستان کے ناول نگاروں اور ان کے موضوعات سے گہری دل چسپی رکھتے ہیں۔
- ۲۔ ڈیوڈ واٹر مین کی کتاب Where Worlds Collide: Pakistani Fiction in the New Millennium ۲۰۱۵ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ کتاب کو دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ صفحات کی تعداد ۲۶۰ ہے۔
- ۳۔ لاہور میں ایک کارڈیلر کے پاس ملازمت کا ابتدائی تجربہ حاصل کرنے والے محسن حامد اس وقت عالمی ذرائع ابلاغ کا موضوع بنے جب امریکا کے سابق صدر باراک اوبامانے ان کے ناول کو ۲۰۱۷ء میں مطالعہ کر دہ کتابوں میں اول نمبر پر رکھا۔ محسن حامد کم و بیش 15 سال سے امریکا میں مقیم ہیں اور ان کی دل چسپی کا شعبہ ادب اور قانون ہے۔ ان کا مذکورہ ناول The Reluctant Fundamentalist کو فلمی قالب میں بھی ڈھالا جا چکا ہے۔ جب کہ ان کے دیگر ناولوں میں Exit West اور In Rising Asia Moth Smoke, How To Get Filthy Rich شامل ہیں جو مشہور غیر ملکی اعزازات سے نوازے جا چکے ہیں جب کہ ان کو امریکا کی کئی جامعات کے نصاب میں بھی شامل کیا جا چکا ہے۔